عباد اللہ فاروقی

ڈاکٹر رفیع الدین کے تعلیمی نظریات

ڈاکٹر رفیع الدین کے نزدیک تعلیم ہمیشہ نظریۂ حیات سے معرضِ وجود میں آتی ہے۔ ان کا یہ نظریہ ڈیوی اور پرس نن کے نظریہ کے برعکس ہے جس کے مطابق تعلیم کسی مخصوص نظریہ حیات کی پابند نہیں ہے۔ ان کا فلسفہ تعلیم یہ ہے کہ درسگاہ پورے سماج کا مظہر ہونی چاہیئے۔ مدرسے کی چار دیواری میں وہی زندگی جاری وساری ہونی چاہیئے جو پورے سماج میں جاری وساری ہے۔ درسگاہ کی سماجی زندگی میں بچوں کو باہمی تعامل سے معاشرت کا رکن بننا، اسی تمدن کا مظہر بننا اور انہیں روایات کے سہارے چلنا جن پر ان کے سماج کی بنیاد ہے سیکھنا چاہیئے۔

اس کے برعکس ڈاکٹر رفیع الدین کا نکتۂ نظر یہ ہے کہ ہر نظریۂ تعلیم کو اس نظریۂ حیات کی پوری وضاحت کرنی چاہیئے جس کی خاطر وہ قائم ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے تعلیم کے ابتدائی اصولوں میں جس نصب العین کو شامل کرنے پر زور دیا ہے وہ حُسن، خیر اور صداقت پر مشتمل ہے۔ یہ نصب العین اپنے اجزاء کے مکمل ہونے کی صورت میں خالقِ حقیقی پر مُنتہی ہوتا ہے۔ مولوی سبطین احمد بدایونی اس توحیدی نصب العین کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

"ڈاکٹر صاحب کے فلسفہ تعلیم کا لب لباب یہ ہے کہ تعلیم کے زیر اثر جو چیز نمو پاتی ہے وہ انسان کا نفسیاتی وجود ہے۔ جس طرح حیاتیاتی وجود کو فطرت نے کچھ تقاضے عطا کیئے ہیں جو حفظ و بقا کا باعث ہوتے ہیں، اسی طرح نفسیاتی وجود کو ایک تقاضا دیا گیا ہے جو نفسیاتی نمو کا باعث ہوتا ہے۔ یہ تقاضا ہے حسُن کی جستجو جو انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ حسُن کا محل صرف مادّی صورتیں نہیں ہیں بلکہ ہر خیر حسن ہے، ہر صداقت حسن ہے۔ لہذا انسان کو انفرادی اور اجتماعی زندگی کا نصب العین ایسے تصوّر کو بنانا چاہیئے جو سراپا حسن ہو، سراپا خیر ہو اور سراپا صداقت ہو اور ایسا نصب العین جو ان

محاسن کا مظہر کامل ہو صرف خدا کی ذات ہو سکتی ہے۔ تعلیم چونکہ نوخیز نسل کے نفسیاتی نمو کا اہتمام کرتی ہے اس لئے تعلیم کا مقصدِ اوّل بھی یہ ہونا چاہیئے کہ نو عمر افراد میں اس نصب العین سے محبت اور اس کی خدمت و بندگی کا جذبہ پیدا ہو۔ تمام سرگرمیاں اور تمام آرزوئیں اسی محور پر گردش کرنے لگیں"۔ ۱؎

ڈاکٹر صاحب کے نزدیک تعلیمی نمو کا تقاضا انسان کی عین ذات کا تقاضا ہوتا ہے۔ جسم کا تقاضا نہیں ہوتا۔ یہ تقاضا نام ہے کسی تصوّر یا نصب العین کی آرزو کا جس کے متعلق یقین ہوتا ہے کہ حسن، خیر اور صداقت اس میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ گویا تقاضا حسن، خیر اور صداقت طلب کرتا ہے۔ اور انسان کا اخلاقی احساس طلب علم و ذوقِ جمال سب اسی کے تابع رہتے ہیں۔ یہ تقاضا انسان کے لاشعور سے تعلق رکھتا ہے جس کو فرائڈ Libido کے نام سے موسوم کرتا ہے۔

بقول ڈاکٹر رفیع الدین جس طرح نصب العین بڑھ کر نظریاتی مسلک بن جاتا ہے اسی طرح نصب العین کا پرستار ایک نظریاتی ہستی یا شخصیت ہو جاتا ہے۔ ہر فرد جو اپنے نصب العین سے محبّت کرتا ہے، جانتا ہے کہ نصب العین نے جو معیار قائم کئے ہیں، وہ کیا ہیں۔ ان کے بموجب وہ یہ امتیاز کر سکتا ہے کہ کون سی شے نیک ہے کون سی بد۔ کون سی حسین ہے اور کون سی بدنما۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ جس طرح حیاتیاتی نمو کا تقاضا متصوّر نہیں ہو سکتا جب تک کہ اُس کو جسمانی صورت یا معنوی وجود کا تصوّر نہ کریں۔ جس کو اس تقاضائے نمو نے تخلیق کیا اور اپنی کارفرمائی کا مظہر بنایا ہے۔ اس طرح تعلیمی نمو کا تقاضا بھی تصوّر میں نہیں آسکتا جب تک کہ ساتھ ہی ساتھ اس نظریاتی ہیت بالفاظِ دیگر اس شخصیت کا تصوّر نہ کریں جس کو یہ تقاضا تخلیق کرتا اور اپنی کارفرمائی کا مظہر بناتا ہے۔ نصب العین اسی طرح نظریاتی ہیئت یعنی ایک پیکر تصوّر بن جاتا ہے۔

نظریاتی مسلک کو مکمل اسی وقت کہا جائے گا کہ ظاہری پیکر اور باطنی جوہر دونوں مکمل ہوں۔ باطنی جوہر تو وہ ذہنی تصوّر وہ اندرونی مغز ہوتا ہے جس کو نصب العین کہتے ہیں اور جس کی بنیاد پر نظریاتی مسلک تعمیر کیا گیا ہے۔ ظاہری پیکر وہ فطری سرگرمیاں ہیں جن پر نصب العین کا رنگ چڑھا دیا گیا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ نظریاتی مسلک مکمل اسی وقت ہو سکتا ہے کہ نصب العین میں کوئی خامی یا کمی نہ ہو اور اس کو ان تمام اہم سرگرمیوں پر نافذ کیا جا سکے جس کو آدمی فطرتاً خیال کرتا ہے مثلاً مذہبی، اخلاقی، قانونی، سیاسی، تعلیمی وغیرہ۔ ۱؎

۱؎ تعلیم کے ابتدائی اصول مصنفہ ڈاکٹر رفیع الدین دیباچہ (جلد دوم)

ڈاکٹر رفیع الدین کے تعلیمی نظریات کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدین نے اپنے نظریۂ تعلیم کی بنیادیں حقیقتِ انسان پر اُستوار کی ہیں۔ ان کے نزدیک انسان کائنات کے اعلیٰ ترین منازلِ ارتقا کا مظہر ہے۔ حیاتیاتی ارتقا انسان میں آکر اعلیٰ ارتقا کی صورت اختیار کرتا ہے۔ جس کی بدولت ارتقاء کا یہ جسم اور بدن اعضاء وجوارح کی ترقی پذیر تبدیلیوں کی صورت میں ظاہر نہیں ہوتا بلکہ عقیدہ اور نظریۂ حیات کے ارتقاء کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

ڈاکٹر حیاتیاتی اجتماع اور نظریاتی اجتماع کا موازنہ کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ نباتات اور حیوانات میں "وجود" کی اکائی عضویہ ہے۔ جب کہ نظریاتی اجتماع میں وجود کی اکائی "نظریاتی انسان" ہوتا ہے۔ عضویہ کا نشوونما حیاتیاتی عمل ہے۔ جس میں بچپن بلوغت کبر سنی کے مدارج ہیں "نظریاتی انسان کی نشوونما" عشق کا عمل ہے۔ وہ محبت جو انسان اپنے نصب العین سے پیدا کرتا ہے، وسیلۂ ارتقاو نشاۃ ہے۔ عضویہ باز تخلیق کے ذریعے توسیع نسل اور کثرتِ افراد میں نمود پذیر ہوتا ہے۔ جب کہ نظریاتی اجتماع میں وسیلہ باعثِ تعلیم و تربیت ہے۔ وہ لوگ جو ایک ہی نظریہ کے حامل ہوتے ہیں، تعلیم کے ذریعہ ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ تعلیم کے ذریعے ان میں نسل ہائس تسلسل اور وحدتِ تاریخ پیدا ہوتی ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدین کے نزدیک تعلیم، نظریاتی اجتماع کا وسیلۂ بقا و ترقی ہوتی ہے۔ نیز تعلیم کا مقصد اس نظریہ اور طریقہ زندگی کا فروغ ہے جس کے ذریعے وہ اجتماع وجود میں آتا ہے جو انسانوں کی منفرد خصوصیت ہے۔ اقوام و ملل کا قیام ہی اس امر پر ہے کہ وہ اپنی ماہیت اور اصلیت نظریۂ حیات (IDIOLOGY) پر مبنی ہیں۔ انسانوں کا زندہ رہنا اور ایام زندگی گزارنا ان کی حقیقت کا جزُ ہے۔ مگر اس کے ساتھ وہ نظریاتی انسانوں کی حیثیت سے بھی زندہ رہتے ہیں جس کی بدولت ان میں طریق زندگی کی وحدت اجتماعیت، اداراتی استحکام، اپنی ہیئت میں ایک ہی تقدیر سے وابستہ ہونا اور ایک ہی مستقبل کے لئے تیار ہونا جیسے حقائق پائے جاتے ہیں۔ جن سے معاشرتی زندگی مرکب ہوتی ہے۔ تعلیم کا مقصد اس اجتماعیت اور اس کے اسالیب اور بندھنوں کے قیام مسلسل کی ضمانت دینا ہے۔ اس لئے تعلیم ہمیشہ پابند نظریہ پیشِ رفت ہے۔ جس کے ذریعہ اجتماع اپنے تسلسل کو قائم رکھتا ہے اور فرد اپنی فطرت حیات کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدین یہ طے کرلینے کے بعد کہ تعلیم ارتقاء کی اعلیٰ ترین منازل یعنی تخلیقِ انسانی کا ناگزیر وسیلہ ہے اور اپنی ماہیت میں طرز زندگی اور عقیدۂ حیات کی اشاعت ہے یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ صحیح عقیدہ و نظریہ

کیا ہے۔ وہ اس کو بھی انسانی فطرت کے قوام میں تلاش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان کی فطری تقویم میں کسی نہ کسی غایت اعلیٰ کے لئے جدوجہد ودیعت کی گئی ہے۔ انسانی زندگی کا جوہر مسلسل عمل ہے۔ یہ عمل فطرت انسانی کے اصل تقاضا کی بازگشت ہے اور وہ اصل تقاضا کسی نہ کسی اعلیٰ ترین غایت کا حصول ہے۔ اعلیٰ ترین غایت تلاش حسن ہے۔ وہ "حسن" یا غایت کی تعبیر اس امر سے کرتے ہیں کہ اعلیٰ ترین غایت وہ ہے جس میں کوئی نقص نہ ہو۔ اس میں بدرجہ اتم حسنات موجود ہوں اور زندگی کے ہر اعلیٰ ترین تقاضے کی تشفی کا اس میں سامان ہو۔ چنانچہ اس کے اندر حق اور قوت جبر و قہر مانیت، شان و شوکت، جمال و جلال کے داعیان کی پوری تکمیل کے اسباب ہوتے ہیں۔

بقول ڈاکٹر صاحب ہر شخص حسن کا متلاشی ہے۔ وہ اسے چھوٹے چھوٹے معروضات میں تلاش کرتا ہے۔ مگر مطمئن نہیں ہوتا۔ وہ حسین چیزوں سے لو لگاتا ہے لیکن محروم لذت رہتا ہے۔ وہ گویا ایک ایسے مقصود کو پا لینے کی فکر میں مضطرب ہے جو سراپا حسن و چشمہ حیات ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ فکر علامہ اقبال کے فکر سے مماثل ہے علامہ فرماتے ہیں۔ ؎

چہ کنم کہ فطرتِ من بمقام در نسازد — دلِ ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے
چو نظر قرار گیرد بہ نگارِ خوبروئے — تپد آں زماں دلِ من پئے خوبتر نگارے
ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے — سرِ منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے
طلبم نہایت آں کہ نہایتے ندارد — بہ نگاہِ ناشکیبے بہ دلِ اُمید وارے

ڈاکٹر رفیع الدین یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ پورے تعلیمی نظام کو جس غایت یا نظریاتی اساس پر تعمیر ہونا چاہیئے وہ خدا کا تصور ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ خدا کا تصور اتنا عالمگیر ہے کہ اس پر سب انسان متحد ہو سکتے ہیں۔ اس طرح بلالحاظ و اختلاف مذہب و ملت محض انسانی غایات، محرکات اور تقاضوں کی تحلیل سے خدا تک رسائی ہو سکتی ہے۔ اس تصور میں سب ہی شریک ہو سکتے ہیں۔ وہ ایسے تعلیمی نظام کو تشکیل دینا چاہتے ہیں۔ جس میں ہمارے معاشرے کی نظریاتی اساس صورت پذیر ہو سکے۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ اس معاشرے میں سب ہی مذاہب کے لوگ شریک ہیں۔ افراد کو اللہ تعالیٰ کے اوصاف کا حامل بنانا اور ان کو خدائی خلاق سے آراستہ کرنا ہمارے نظامِ تعلیم کا مدعا ہونا چاہیئے۔ صرف ایسی صورت میں ہی عالمگیر اخوتِ انسانی کے نصب العین کو عملی جامہ پہنا سکتے ہیں۔

مختصر یہ کہ بقول ڈاکٹر رفیع الدین "انسان کی فطرت میں تعلیمی نمو کا ایک تقاضا ہوتا ہے۔ اس کی تمام

سرگرمیوں میں قوّتِ محرک صرف یہی تقاضا ہوتا ہے ۔ حتیٰ کہ ان سرگرمیوں میں بھی جو اس کی حیوانی جبلّتوں سے براہِ راست تعلق رکھتی ہیں ۔ اس لئے ارتقائے حیات کی انسانی منزل پر اگرجس کو تاریخ ارتقاء کہا جاتا ہے یہی تقاضا عمل ارتقا کا محرک ہوتا ہے ۔ تعلیمی نمو کا تقاضا اپنا کامل اور آزادانہ مظاہرہ اسوقت کر سکتا ہے اور صحیح تشفی اسی حالت میں پا سکتا ہے کہ حُسن، خیر اور صداقت کے کسی اعلیٰ دارفع نصب العین کی طرف راجع ہو ۔ اسی صورت میں انسانی شخصیت آزادی کے ساتھ کمال کو پہنچ سکتی ہے ۔ جب تک اس نصب العین کے حصول کی طرف انسانی سرگرمی کو قصداً وعمداً رجوع نہ کیا جائے ، اس وقت تک سرگرمی نہ تو اپنے علو اور رفعت کو پہنچ سکتی ہے اور نہ صحیح معنوں میں تعلیمی فائدہ پہنچا سکتی ہے ۔ جب سرگرمی کا رخ قصداً وعمداً اس نصب العین کی جانب نہیں رکھا جاتا تو وہ کسی دوسرے نصب العین کی طرف رخ کر لیتی ہے ۔ جس میں حُسن، خیر اور صداقت کے اوصاف موجود نہیں ہوتے ۔ ہر نصب العین کچھ نفسیاتی مکاتب اور فلسفے رکھتا ہے جو اس نصب العین پر مبنی ہوتے ہیں ۔ لیکن فلسفے اور نفسیاتی نظام سچے وہی ہو سکتے ہیں جو حسن خیر اور صداقت کے اعلیٰ ترین مظہر پر مبنی ہوں چونکہ صداقت ادلی میں دوئی کو دخل نہیں ہوتا ۔ اس لئے سائنس کی تمام معلومات خواہ طبعی ہوں یا حیاتیاتی یا نفسیاتی صرف اسی نصب العین سے ہم آہنگ ہو سکتی ہیں جو حسن خیر اور صداقت کا مظہر کامل ہوں ۔ ایسا نصب العین صرف وہ خود آگاہ ذات ہو سکتی ہے جو قادرِ مطلق ہو اور ہر نقص سے منزّہ ہو ، وہی حقیقت اولیٰ ہو سکتی ہے ۔ اُسی کو کائنات کا واحد خالق اور رب یعنی پرورش کرنے والا یا ارتقاء دینے والا کہا جا سکتا ہے ۔ انسان کی شخصیت کا یہ تقاضا کہ تعلیمی نمو حاصل کرے اور کمال کو پہنچے درحقیقت آخری اظہار ہے اس تقاضے کا جو کائنات کی خود آگاہی میں انسانیت کو ذریعۂ کمال پر پہنچانے کے لئے مضمر تھا ۔ اس تقاضے نے اس سے پہلے یوں ظہور کیا تھا کہ عضویاتی ابدان نے حیاتیاتی نمو اور کمال کی طلب ظاہر کی تھی ۔ یہ طلب حیاتیاتی قوانین کے روپ میں نمودار ہوئی اور زندگی کو انسان کے بدن کی شکل دیکر حیاتیاتی ارتقاء کا سلسلہ حدِ کمال کو پہنچا گئی ۔ اس سے پہلے یہ تقاضا مادّی کائنات میں مادّی ارتقاء وکمال کی طلب بن کر کارفرما رہا تھا ۔ یہ طلب طبیعی قوانین کے روپ میں ظاہر ہوتی رہی اور مادّی عالم کو اس درجۂ کمال تک لے آئی جہاں وہ ذی حیات اجسام کی پیدائش سے پہلے پہنچ گیا تھا ۔" [1]

---

[1] تعلیم کے ابتدائی اصول جلد دوم ص ۱۷۶

ڈاکٹر صاحب کے نزدیک معلم کا فرض اوّلین یہ ہے کہ وہ طالب علم کو توحیدی نصب العین کی اہمیت سے روشناس کرائے۔ فرماتے ہیں کہ اس زمانے میں بیسیوں فکری مذاہب پیدا ہو گئے ہیں، جنہوں نے تصوّرِ توحید کے مقابلہ میں حریفانہ حیثیت حاصل کر لی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ افراد کے روحانی تقاضے گمراہ ہو رہے ہیں اور تعلیمی نمو کو شدید نقصان پہنچ رہا ہے۔ ان مذاہب میں سب سے زیادہ ہر دلعزیز اور قوی الاثر، مگر تعلیمی اعتبار سے سب سے زیادہ مضرت رساں لادینی قوم پرستی ہے۔ چنانچہ قوم، وطن، ملک، نسل، زبان کو مقصود بالذات سمجھ کر جتنی زیادہ محبت کی جائے گی اللہ سے محبت اتنی ہی کم ہوگی اور بچہ کامل تعلیمی نمو پانے سے اتنا ہی قاصر رہے گا۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ طلبہ کے ذہن پر یہ بات نقش کر دینی چاہیئے کہ حسن خیر اور صداقت کے اوصاف جو جھوٹے اور غلط مذاہب کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں محض فریب ہیں۔ کیونکہ ان میں سے ایک بھی کائنات کا معمّا من حیث الکل حل نہیں کر سکتا۔ ان کی زندگی چند روزہ ہے۔ کیوں کہ ان کے پرستار عرصہ تک ان کے جھوٹے حسن سے مبتلائے فریب نہیں رہ سکتے۔ نوعِ بشر کے لئے ان سے مسلسل محبت کرتے رہنا تباہی کا باعث ہوگا۔ وہ تنہا نصب العین جو انسانیت کو مکمل اور مستقل طمانیت بخش سکتا ہے صرف خدا ہے۔ معلّم کو یاد رکھنا چاہیئے کہ فلسفہ خود آگاہی یعنی وہ فلسفۂ کائنات و فلسفۂ بشر جو حقیقت اولیٰ کے صحیح فہم پر مبنی ہے ایک طاقتور ذہنی اوزار ہے۔ معلّم اس کو اپنے طلبہ کو باطل مکاتبِ فکر سے محفوظ رکھنے کے لئے استعمال کر سکتا ہے۔ اگر ان سے کچھ گرویدگی پیدا ہو چکی ہے تو اس سے اس کی بیخ کنی بھی کر سکتا ہے۔

پیشتر اس سے کہ ڈاکٹر رفیع الدین کے نظریات کو قرآن حکیم کی روشنی میں پرکھیں مناسب ہوگا کہ ان کے تصوّرات کا افلاطونی اور یونانی فلسفۂ حسن کی روشنی میں جائزہ لیا جائے۔

یونانی فلسفہ حسن اور ڈاکٹر رفیع الدین کا نقطۂ نظر

افلاطون پہلا فلسفی ہے جس نے فلسفہ حسن کی ایک باضابطہ حیثیت متعین کی۔ اس نے جمالیات سے وابستہ اصول و قوانین کو مدوّن کیا۔ وہ مبلّغ عینیت (IDEALISM) ہے۔ وہ اس کائنات کو حقیقی نہیں مانتا۔ یہ کائنات اس کے نزدیک نامکمل اور اصل حقیقت کا عکس ہے۔ افلاطون کہتا ہے کہ اس نامکمل کائنات میں حسن جمال کی اصل اور مکمل حالت نہیں مل سکتی۔ کیوں کہ یہ ظل ہے اس حسن کا جو مستور ہے۔ فلاطینوس کا نظریہ یہ ہے کہ انسانی روح نے اس عالم آب و گل میں آنے سے پہلے آسمانوں پر ازلی حسن کے جلوے مشاہدے کئے تھے۔ چنانچہ وہ یہاں آکر

اس حسن کی تلاش میں سرگرداں ہے۔

فلاطینوس کے نظامِ فکر کو افلاطونیت سے موسوم کرتے ہیں۔ اس فلسفہ کی رو سے آسمانی اور دنیاوی حسن میں ایک رشتۂ مماثلت قائم ہے۔ نو افلاطونیت (NEOPLATONISM) نے متصوفانہ افکار کو بے حد متاثر کیا۔ ڈاکٹر رفیع الدین کے تصورات پر بھی بظاہر اس کی گہری چھاپ معلوم ہوتی ہے تاہم وہ قرآنِ حکیم اور فکرِ اقبال سے بنیادی طور پر متاثر ہیں۔

ان کا فلسفہ کسی حد تک STOICS کے فلسفہ سے بھی ملتا جلتا ہے۔ تاہم یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کا فکر STOICS کے فلسفہ سے ماخوذ ہے۔ STOICS کے نزدیک خیر حسن ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین کا بھی کم و بیش یہی عقیدہ ہے۔ STOICS کے نزدیک ہر حسین شے حاملِ خیر بھی ہے۔ حسن اسقدر لطیف ہے کہ وہ کثافت شر کا متحمل ہو ہی نہیں سکتا۔ STOICS کا یہ خیال کہ جس کے پاس نظارۂ جمال کے لئے آنکھیں نہیں وہ مکمل انسان نہیں حقیقت لئے ہوئے ہے۔ علامہ اقبال بھی اس کے قائل ہیں۔ جیسا کہ شعرِ ذیل کو پیش کر کے وہ اس حقیقت کی طرف اشارہ فرماتے ہیں۔ ؎

موسیٰ زہوش رفت بہ یک جلوۂ صفات
تو عینِ ذات مے نگری در تبسمے

مشہور یونانی المیہ نگار سوفوکلیز اس عقیدہ کا حامی ہے کہ مظاہر زیست ہی سے نیکی حسن کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ حکما حسن کی تعریف کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نیکی خیر و شر اور محبت وغیرہ کی مانند حسن بھی ایک مجرّد کیفیت ہے۔ اس لئے جو تعریفات حسن کی ملتی ہیں وہ محض الفاظ کی شعبدہ بازی ہے۔

تاہم حسن کی ہمہ گیر اہمیت کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے اثرات اخلاقیات پر بھی کارفرما ہیں۔ یورپ میں "جمالیاتی وجدانیت" کا مکتبِ فکر ملتا ہے جس کا بانی شیفٹسبری تھا۔ اس نے جمالیات کی روشنی میں اخلاقی قواعد وضع کئے۔ چنانچہ اس نے جمالیاتی حس کی بنا پر اخلاقی حس کی اصلاح وضع کی۔ اس کا قول ہے کہ

"حسن ہم آہنگی اور مناسبت (ترتیب) کا نام ہے۔ مناسبت اور ہم آہنگی ہی حاملِ صداقت ہیں اور جہاں اجتماعِ حسن و صداقت ہو وہاں خیر ہے۔"

فلاسفہ کے نزدیک حسن بذاتِ خود ایک مقصد ہے۔ اسے کسی اور مقصد کے لئے ذریعہ نہیں بنایا جا سکتا۔

ان نظریات کی روشنی میں جب ہم ڈاکٹر رفیع الدین کے تصورات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں اس میں گہری مماثلت نظر آتی ہے۔ تاہم ڈاکٹر رفیع الدین کے فکر کی اساس یونانی فلسفۂ جمال نہیں بلکہ یہ قول کہ اللہُ جَمِیْلٌ وَیُحِبُّ الْجَمَالَ (کہ خدا جمیل ہے اور جمال کو دوست رکھتا ہے) یا قرآن حکیم کی وہ آیات جمال ہیں جن کا ذکر ڈاکٹر نصیر احمد ناصر نے اپنی کتاب "جمالیات قرآن حکیم کی روشنی میں" واضح طور پر کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک حسن ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے۔ حسن صورت کو حسن سے یا حسن تخیل کو حسن خارجی سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس اعتبار سے ان کے فکر اور یونانی فکر کے درمیان حدِ فاصل قائم کی جا سکتی ہے۔ افلاطون اس کائنات کو ماورائی عالم کا عکس تصور کرتا ہے۔ لہٰذا اس کے نزدیک خارجی حسن نامکمل اور ناقص ہے۔ اس کے برعکس ڈاکٹر رفیع الدین حسن خارجی اور حسن حقیقی میں وحدت قائم کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں۔

"شکل وصورت کے پیکر میں حسن پیدا کرنے اور اس کی تعریف کرنے کی تمنا صرف ایک رُخ ہے اس جذبے کا کہ ہر چیز میں حسن پیدا کیا جائے اور اس کی ثناء وستائش کی جائے۔ چنانچہ ہم اعمال کے نتائج اور اخلاقی ثمرات میں بھی حسن پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ گویا انسان کا جمالیاتی تقاضا اخلاقی تقاضا بھی ہے روحانی تقاضا بھی ہے اور عملی تقاضا بھی۔ ذہن کی عملی سرگرمی جس کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ حق کو تلاش کیا جائے اخلاقی سرگرمی بھی ہے۔ کیونکہ اس سرگرمی سے نصب العین کی طاقت مقصود ہوتی ہے۔ جمالیاتی سرگرمی بھی ہے کیونکہ حقائق کے پیکر میں حسن تلاش کرتی ہے اور روحانی سرگرمی بھی، کیونکہ جس حسن کی جستجو ہے اس کی ثنا وستائش اسی میں داخل ہے۔

یہ تمام سرگرمیاں باہم مربوط و ہم آہنگ ہوتی ہیں جب ایک دوسرے کی کمی پوری کر دیتی ہیں، سب باہم مخلوط ہو جاتی ہیں اور ایک سے دوسری میں شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کا سبب بس یہ ہے کہ تمام تقاضے جو ان سرگرمیوں کے محرک ہوتے ہیں، درحقیقت ایک ہی تقاضۂ فطرت کے مختلف پہلو ہیں۔ اور وہ تقاضا ہے آرزوئے حسن۔ اس لئے ان میں سے اگر کسی تقاضے کو صحیح راہِ اظہار نہیں مل رہی ہے تو اُس کا نقصان دوسرے تقاضوں کو بھی پہنچتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی کا تقاضائے حسن روحانی، اخلاقی اور عملی تقاضوں کی طرح اس کے نصب العین سے وابستہ اور اس کا خادم بن جاتا ہے۔ جس طرح ہر نصب العین اپنے دامن سے وابستہ ایک مخصوص چھاپ لگا ہوا سائنٹیفک سرمایہ اور فلسفہ رکھتا ہے۔ اک مخصوص نمونے کا ضابطۂ اخلاق اور اک خاص نمونے کی نیکیاں اس سے منسلک ہوتی ہیں اور پرستش اور عبادت کا اک خاص انداز اس کے لئے قائم ہو جاتا ہے۔ بالکل

اسی طرح ذوقِ جمال کی تسکین کے تمام مختلف طریقے بھی ہر نصب العین کے ساتھ مخصوص رنگ کے ہوتے ہیں"۔[1]

ڈاکٹر صاحب یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ جو شخص اعلیٰ سے اعلیٰ حسن وکمال والے نصب العین کے ساتھ شدت سے محبت رکھتا ہے۔ اس کی فنکارانہ تخلیق بھی اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کی ہوگی۔ نصب العین ——— ناقص ہے تو اُس کے تقاضائے حسن کو عمل کا موقع پورا نہیں مل سکتا۔ لہٰذا باطل نصب العین کا شیدائی اعلیٰ درجے کی فنکارانہ تخلیق کا اہل نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب کے یہ تصورات گو آفاقی حیثیت رکھتے ہیں تاہم وہ قرآنی نقطہ نظر کے مخالف نہیں۔ قرآن کریم عقیدہ وتوحید ورسالت کے ساتھ حسنِ عمل، حسنِ کردار اور حسنِ اخلاق پہ زور دیتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا بھی نقطۂ نظر یہی ہے۔ ان کا نظریاتی انسان، اپنے حسنِ عمل سے حسنِ مطلق کا جویا ہوتا ہے اور بتدریج ترقی کی منازل طے کرتا ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے حسنِ مطلق کا شیدائی اپنے فعل محبت کی وجہ سے خود بھی حسین ہے اور اس کا ہر فعل بھی حسین ہے۔ وہ جدھر جاتا ہے حسن ہی کی تخلیق کرتا چلا جاتا ہے۔ اسے یہ حسن اتباع اسوۂ رسول و احکام شریعت کی پیروی سے حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر حسن مطلق یا ذات خداوندی سے محبت یا رابطہ متصور ہی نہیں ہوسکتا۔ یہی ایک راستہ ہے جس پہ گامزن ہوکر جمال مطلق کا شیدائی تقرب الٰہی حاصل کرسکتا ہے اور نتیجہ کے طور پر خود کو جمال کی نعمتوں سے مالا مال کرسکتا ہے اللہ تعالیٰ کے بعد اس کی حسین ترین مخلوق سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات ہے۔ جیسا کہ عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

حسنِ یوسفؑ دمِ عیسیٰؑ یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں ؎

یا صاحب الجمال و یا سیّد البشر
من وجہک المنیر لقد نور القمر
لا یمکن الثناء کما کان حقہ
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

۱؎ تعلیم کے ابتدائی اصول (ترجمہ)، ص ۲۱۵-۶

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی "مدارج النبوۃ" میں ارقام فرماتے ہیں۔

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم از فرق تا بقدم ہمہ نور بود کہ دیدہ حیرت در جمال و کمال خیرہ مے شود مثل ماہ و آفتاب تاباں و روشن بود۔ اگر نقاب بشریت پوشیدہ بودے ہیچ کس را مجال نظر و ادراک حسن او ممکن نبودے۔" ؎۱

علامہ زرقانی تحریر فرماتے ہیں۔

فاعطی نبینا صلی اللہ علیہ وسلم الحسن کلا قال القرطبی لم یظہر لنا تمام حسنہ صلی اللہ علیہ وسلم رفقنا من اللہ تعالیٰ لانہ ظہر لنا تمام حسنہ لما اطاقت اعیننا رویتہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ ؎۲

"اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حسن تمام عطا فرمایا ہے۔ امام قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تمام حسن و جمال ہم پر ظاہر نہیں ہوا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم ہے۔ ورنہ ہماری آنکھیں آپ کے دیدار کی طاقت نہ رکھتیں۔"

انبیاء کے علاوہ اولیاء اللہ بھی قرب خداوندی کی بدولت جمالِ معنوی کی دولت سے مالا مال ہوتے ہیں۔

حضرت سید علی ہجویریؒ اپنی کتاب "کشف الاسرار" میں فرماتے ہیں۔

"اے علی تو عجب دلستانی تو یوسف کنعانی تو جانِ جہانی تو دانندہ صور و معانی آخر چہ خواندی ہچنیں در اضطرارے ماندی۔"

"اے علی تو تو عجب دلربا ہے تو گویا یوسفِ کنعانی ہے۔ تو تو کوئی جہاں کی جان ہے تو ظاہر و باطن کا جاننے والا ہے۔ آخر تو نے کیا پڑھا کہ تو ایسا گھبرایا ہوا ہے۔"

بقول ڈاکٹر رفیع الدین زندگی کا وہ حقیقی نصب العین جو انسانی خوبیوں کو اُجاگر کرتا ہے۔ اس کے خیالات کو سنوارتا ہے اور فطرتِ انسانی کو صیقل کر دیتا ہے۔ یہ ہے کہ انسان کے اندر محبت الٰہی کا جو فطری تخم ہے اس کے تقاضے کے تحت وہ حسنِ مطلق (خالقِ کائنات) کی صحیح معرفت حاصل کرے اور انسانی زندگی کو حسین اور ابدی بنانے کے لئے جسم و روح کی ترقی کا سامان بہم پہنچائے تاکہ وہ آئندہ زندگی میں درجاتِ عالیہ پر فائز ہو سکے۔ غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ڈاکٹر رفیع الدین کی یہ تعلیم عین اسلامی تعلیم ہے۔ جس کا حصول اتباع اسوۂ

؎۱ مدارج النبوۃ جلد اوّل ص ۱۱۰ ؎۲ زرقانی جلد پنجم ص ۱۹۸

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر متصور ہی نہیں ڈاکٹر صاحب نے اگرچہ اسے آفاقی رنگ میں پیش کیا ہے۔ لیکن ان کا مقصد یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو اتباع سنت و قرآنی تعلیم کی دعوت دی جائے۔ میرے نزدیک ڈاکٹر صاحب لوگوں کو در پردہ اسلامی تعلیم ہی کی دعوت دے رہے ہیں۔ کیونکہ ان کا نصب العین توحیدی ہے۔ اسی نصب العین حیات کا تذکرہ قرآن کریم نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ یعنی جن و انس کی زندگی کا نصب العین خالق کائنات کی معرفت حاصل کرنا اور اس کے احکام پر عمل پیرا ہونا ہے۔ معرفتِ حق حسنِ عبادت و حسنِ اخلاق ہی سے ممکن ہے۔ عملی زندگی کو چھوڑ کر ظن و قیاس کے ذریعے تلاشِ حسن یا معرفتِ حق کا تصور ہی محال ہے۔ اسلامی نظامِ تعلیم میں ان نام نہاد علوم کو ناپسند کیا گیا ہے جو محض ظن و تخمین اور لاطائل قیاسات پر مبنی ہیں۔ جو لوگ حسنِ مطلق کے متلاشی ہیں انہیں یہ عرفان عبادات اور اتباعِ سنت سے تو حاصل ہو سکتا ہے لیکن محض ظن و تخمین یا کشف و اوہام سے وہ مقصود حاصل نہیں کر سکتے جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا (۱۷ : ۳۶)

"اور اس بات کے پیچھے نہ پڑا کرو جس کا تمہیں علم نہیں کیونکہ کان، آنکھ اور دل ہر ایک سے پرسش ہوگی۔"

قرآن مجید کا زور محسوس اور ٹھوس حقائق پر ہے۔ اور عجمیت و یونانیت کا حقائق کی بجائے نظریات پر۔ جب مسلمان یونانی فلسفہ سے بدگمان ہو گئے جس کی بنیاد تخمین و ظن پر تھی تو انہوں نے علم کے ایسے سرچشمہ کی تلاش شروع کی جو قطعی و یقینی ہو۔ اس طرح علمی دنیا میں اس طریقہ و منہاج کی ابتدا ہوئی جس کا تعلق مشاہدہ و تجربہ سے ہے اور وہ بھی نظری طور پر نہیں بلکہ عملی حیثیت سے۔

قرآن کی رو سے علم کا موضوع خیال و وہم نہیں بلکہ کوئی حقیقت ہی ہو سکتی ہے۔ لیکن علم کے لئے احساس و مشاہدہ شرط ہے۔ احساس و مشاہدہ کا مطلب ہے کسی حقیقت کا شعور و تجربہ میں آنا۔ اس لئے مشاہدہ کے حصول اور مشمولات کی بناء پر علم اور ذرائع علم کے تعلق سے مختلف نظریئے پائے جاتے ہیں۔ اسلام سے پیشتر یہ خیال عام تھا کہ خود حقیقت انسانی و نفس کی معرفت حسنِ مطلق کی معرفت اور علم کا ذریعہ ہے۔ افلاطون نے خارجی دنیا کو حلقۂ دامِ خیال قرار دیا۔ ہر شے کی عین کو جو غیر مادی ہے حقیقی ٹھہرایا۔ اس کے نزدیک شے چونکہ اس کی شبیہہ ہے اسلئے وہ غیر حقیقی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ ادراک بالحواس سے کوئی حقیقی علم حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ ہم اس سے ایک رائے قائم کر سکتے ہیں۔

بانی مسیحیت نے تعلیم دی کہ حقیقت مطلقہ (یا حسن مطلقہ) کی معرفت اور اس سے رابطہ اسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے کہ ہم ایسے سرمایہ کی جستجو کریں جس کا ایک الگ تھلگ اور مستقل وجود ہو۔ ہماری روحانی زندگی اس دُنیا کی قوتوں سے فروغ نہیں پاسکتی۔ جو انسان کی روح کے باہر واقع ہیں، بلکہ خود اس کے اندر ایک نئے عالم کے انکشاف سے ترقی کر سکتی ہیں۔ جس کے پیش نظر مسیحیت نے دُنیا کی خارجی قوتوں سے مُنہ موڑ لیا۔ مغربی فلسفہ یونانیت اور مسیحیت کے اس اثر سے آزاد نہ ہو سکا۔ اس میں آج بھی مادیت اور روحانیت کی تفریق موجود ہے۔ یہاں تک کہ تہذیب و تمدن میں تو یہ تفریق اور زیادہ سختی سے قائم ہو چکی ہے۔

دنیائے قدیم کے تمدن صرف اس لئے ناکام ہوئے کہ انہوں نے حقیقت (خُدا یا حُسن) کی طرف داخل کی راہ سے قدم بڑھایا اور خارج سے منہ موڑ لیا۔ نظریات تو قائم کر لئے مگر طاقت سے محروم ہو گئے۔ محض نظریوں پر کوئی تمدن قائم نہیں ہو سکتا۔ دنیائے جدید کا تمدن اس لئے غیر متوازن ہے کہ مغرب میں حیات انسانی سر تا سر مادیت اور حسیّت تک محدود ہے۔ رُوحانی اور داخلی دُنیا سے اس کا تعلق قائم نہ رہا۔ تمدن اس شعوری اور ارادی جدوجہد سے عبارت ہے۔ جو انسان اپنی زندگی کے گوناگوں حالات کے تحت اپنی احتیاجات و مقاصد کی تکمیل کے لئے کرتا ہے اور کسی نتیجہ کا منتظر رہتا ہے۔

مذہب وہ اصول اور دستور العمل ہے جس سے اس جدوجہد کو ایک مستقل اور محکم اساس مل جاتی ہے۔ اس کے بغیر ناممکن ہے کہ تمدن کی جدوجہد میں کامیاب و کامران ہو اور خیر و سعادت کا منہ دیکھ سکے۔ اس لئے تمدن اور مذہب تو دو حلیف اور متجاذب قوتیں ہیں جن کا وجود ایک دوسرے کے لئے ناگزیر ہے۔

قرآن کریم نے تہذیب و تمدن کے لئے وہ اساس مہیا کر دی جس کی اسے تلاش تھی۔

قرآن کو اس سے پورا اتفاق ہے کہ ہم اس بصیرت کا اثبات کریں جو ہماری ذات میں موجود ہے۔ مگر وہ اس میں اتنا اضافہ کرتا ہے کہ اس طرح جس عالم کا انکشاف ہوتا ہے وہ عالم مادیات سے بیگانہ نہیں۔ قرآن مجاز اور حقیقت کو دو متضاد قوتیں نہیں ٹھہراتا کہ ان میں باہم مصالحت نہ ہو بلکہ حقیقت و مجاز یا عینی (IDEAL) و واقعی (REAL) کے اتصال کا اعتراف کرتے ہوئے دنیائے مادیت کی تسخیر و تصرف کا راستہ دکھلاتا ہے۔ تاکہ واقعیت کی اساس پر حیات انسانی میں توازن پیدا ہو۔ اسلام یونانی عینیت (IDEALISM) کے خلاف ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین کے نظریات میں بھی حقیقت و مجاز کا توازن موجود ہے۔ وہ حقیقت مطلقہ کو حُسن، خیر اور صداقت سے تعبیر کرتے ہیں۔ جس کا شعور ہمیں بتدریج مدارجِ ارتقاء کے

ساتھ ہوتا جارہا ہے۔ اقبال کا موقف بھی کم و بیش یہی ہے جیسا کہ وہ فرماتے ہیں ؎

ہر نگارے کہ مرا پیش نظر مے آید
خوش نگاریست ولے خوشتر ازاں مے بائست (زبور عجم ص ۱۹۲)

اسلام سے پیشتر ذات الہیہ کے ادراک میں بنی نوع انسان نے داخل کی راہ سے قدم بڑھایا اور پھر داخل سے خارج کی طرف۔ قرآن کریم ادراک باطل کو انسان کی روحانی زندگی کا ایک ناگزیر مرحلہ ٹھہراتا ہے۔ اس نے محسوسات و مدرکات کے عالم کو یکساں اہمیت دی کیونکہ وہ حقیقتِ مطلقہ کے علم و ادراک کا ایک ذریعہ ہیں جس کی آیات ظاہر و باطن میں ہر کہیں موجود ہیں۔ قرآن کریم نے آفاق و انفس دونوں کو علم کا ذریعہ قرار دیا۔

"پھر ہم انہیں اپنی نشانیاں آفاق میں اور ان کے اپنے نفس میں دکھائیں گے۔ یہاں تک کہ ان کے لئے کھل جائے کہ وہ حق ہے"۔ (۴۲ : ۵۳)

قرآنِ مجید کی تعلیم یہ ہے کہ حسنِ مطلق کی آیات کا ظہور محسوسات و مدرکات میں خواہ ان کا تعلق خارج کی دُنیا سے ہو یا داخل کی ہر کہیں ہو رہا ہے۔ لہذا ہمارا فریضہ ہے کہ ہم حسنِ خارجی کے ہر پہلو کی قدر و قیمت کا اندازہ کریں اور حصولِ علم میں اس سے مدد لیں۔ حسنِ ازلی سے ربط و اتصال کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ہم کائنات میں ادراک بالحواس کے ذریعہ اُن آیات و نشانات کا مشاہدہ کریں اور ان پر دسترس حاصل کریں اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اتباعِ سنت پر عمل پیرا ہو کر حسنِ ازلی سے تعلق پیدا کریں۔ انسان کی یہ وابستگی قوائے فطرت پر غلبہ حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ثابت ہو گی۔ اس غلبہ میں یہ بات پیش نظر ہونی چاہیئے کہ اس طرح ہمیں اپنی رُوحانی زندگی میں مدارجِ کمال کی طرف بڑھنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حسن مطلقہ کے ادراک کے لئے سمع و بصر کے ساتھ فواد یا دوسرے الفاظ میں ادراک بالحواس کے ساتھ ساتھ قلب کے مدرکات کو بھی قرآن لازم ٹھہراتا ہے

"اور تمہارے کان اور آنکھیں اور دل بنائے، بہت ہی کم تم شکر ادا کرتے ہو۔"

(۳۲ : ۹)

قلب درحقیقت اندرونی بصیرت ہے جس کی بدولت ہم حسنِ مطلق کے ان پہلوؤں سے اتصال پیدا کرتے ہیں جو ادراک بالحواس سے ماوریٰ ہیں۔ قرآنی نقطہ نظر سے قلب یا اندرونی بصیرت کے فروغ کے لئے یہ ضروری نہیں کہ انسان کا رشتہ خارجی دُنیا سے کلیتاً منقطع ہو جائے۔ ہم حسنِ ازلی تک واقعی یا مجازی ہی کی وساطت سے پہنچ سکتے ہیں۔ قرآنِ کریم کے نزدیک وارداتِ قلب علم کا ایک سرچشمہ ہے۔ اس کے

لاوہ دو اور سرچشمے ہیں، عالمِ فطرت اور عالمِ تاریخ۔
قرآنی تعلیمات کی رُو سے یہ عالمِ فطرت جیسا کہ بذریعہ حواس ہمیں اس کا ادراک ہوتا ہے حسن مطلق کا مظہر ہے۔ علم انسانی کی نوعیت تصوری ہے۔ یہ ایک ذریعہ ہے جس سے انسان حسنِ مطلق کے مرئی یا قابلِ مشاہدہ پہلوؤں کی طرف قدم بڑھتا ہے۔ تعلیماتِ قرآنی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس نے حقیقت کے اس پہلو کو بڑی اہمیت دی جس کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کا ارشاد ہے کہ کائنات کی آفرینش ایک کھیل نہیں جس میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں وہ ایک حقیقت ہے۔ اور حسنِ مطلق کی مظہر۔ لہٰذا خدا یا حسنِ مطلق تک پہنچنے کے لئے ہمیں اس سفر کی ابتداء اس کائنات کے حسن، خیر اور صداقت کے عناصر سے کرنا چاہیئے اور خوب سے خوب ترکی طرف بڑھتے رہنا چاہیئے۔ یہی ڈاکٹر رفیع الدین کی تعلیم کا لبِ لباب ہے اور یہی قرآنی نظامِ تعلیم کا مقصد ہے جس کی طرف ڈاکٹر صاحب نے نہایت ہی لطیف و بلیغ اشارے کئے ہیں۔

اساتذہ اور اہلِ قلم حضرات سے!

رسالہ "اسلامی تعلیم" اور "اسلامک ایجوکیشن" اُردو اور انگریزی زبان میں ان اساتذہ اور اہلِ قلم حضرات سے قلمی معاونت کا خواہشمند ہے جو سائنسی علوم بالخصوص طبعیات، کیمیا، حیاتیات، عمرانیات اور نفسیات پر اس انداز سے روشنی ڈال سکیں کہ ان کی نگارشات سے خدا کی وحدانیت کے تصور کو اُجاگر کرنے میں مدد ملے۔ اس قسم کی کوشش پر مبنی اساتذہ کرام کے تیار کردہ مثالی اسباق (MODEL LESSONS) کا خیر مقدم کیا جائے گا اور ان کا معقول معاوضہ دیا جائے گا۔ یہ اسباق کالج کی سطح کے ہونے چاہئیں۔ وہ اساتذہ جو پہلے ہی اس کام میں مصروف ہیں اور اس کا تجربہ رکھتے ہیں، اُنہیں اس سلسلے میں خاص توجہ دینی چاہیئے۔

علاوہ ازیں اس جریدہ میں مختلف زبانوں میں شہرت یافتہ کتابوں کے ایسے تلخیص و تراجم کو بھی شاملِ اشاعت کیا جائے گا جن کا محاکمہ اسلامی اندازِ فکر اور اسلامی نقطۂ نظر سے کیا گیا ہو۔

مضامین صاف ستھرے خط میں ہوں اور کاغذ کے ایک طرف تحریر ہونے چاہئیں۔

سیکرٹری آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگرس
۷ فرینڈز کالونی، ملتان روڈ، سمن آباد، لاہور